© rasailojaraid.com

جو تلاشِ حق میں سرگرداں ہیں ان کے لیے صداقت سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ سچ اپنے متلاشی کو کبھی سبک سر نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی اسے کم رتبہ بناتا ہے " بھلا دی گئی اور دنیائے اسلام کی تلاش نے مغرب سے کوئی تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جہاں اب سائنس پروان چڑھ رہی تھی۔ اس سے پانچ سو برس قبل مسلمانوں کے علم کے شوق کا عالم یہ تھا کہ وہ علم کی تلاش میں یونانی اور عمرانی چشموں سے فیضیاب ہونے کے لیے جندی شاپور (Jendi Shapur) اور حران (Harran) پہنچے تھے جہاں یونانی اور شامی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ انھوں نے بغداد، قاہرہ اور دوسرے شہروں میں اعلیٰ درجہ کی بین الاقوامی درسگاہیں بنوائیں۔ جنھیں بیت الحکمت کہا جاتا تھا۔ انھوں نے بین الاقوامی شہرت کی تجربہ گاہیں بھی بنوائیں جنھیں شمیاس کہا جاتا تھا۔ جہاں ساری دنیا کے سائنسداں اکٹھا ہوتے تھے اور فیض اٹھاتے تھے۔ اب ان سب کی شروعات مغرب میں ہو چکی تھی۔ تولیدو (Toledo) اور سالرنو (Solerno) کے اداروں میں اس زمانہ کی سائنس کی زبان عربی سے کیے گئے ترجمے اس کی بنیاد بنے۔ لیکن ہمارے ملکوں میں اس قسم کی کوئی تحریک باقی نہ رہی۔ ہم لوگ بے تعلق ہو گئے اور سب ہی جانتے ہیں بے تعلقی کے معنی ہیں ذہنی موت۔

ابن خلدون کے زمانہ سے یہ ذہنی علیحدگی اور علم سے بے تعلقی جاری ہے۔ یہ اس زمانہ میں بھی قائم رہی جب دنیائے اسلام میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جیسے عثمانی ترکوں کی سلطنت، ایرانی صفوی حکمرانوں کی بادشاہت اور ہندوستان میں مغلوں کی حکومت۔ ایسا نہیں تھا کہ سلاطین اور شہنشاہ ان ترقیوں سے بے خبر ہوں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ان لوگوں کو وینس (Venice) اور جینیوا (Geneva) کے رہنے والوں کی اس ترقی کا علم نہ رہا ہو جو انھوں نے بندوق سازی میں کی۔ یا وہ پرتگالیوں کی اس مہارت سے ناواقف رہے ہوں جو انھوں نے جہاز رانی اور جہاز سازی میں حاصل کی تھی اور جس کی وجہ سے ان کی حکومت سمندروں پر تھی۔ ان میں وہ سمندر بھی شامل تھے جو حج کے راستے میں پڑتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پرتگالیوں کی جہاز رانی میں برتری محض اتفاقی بات نہیں بلکہ یہ نتیجہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سائنسی ترقی کا تھا جو بڑی جانفشانی سے حاصل کی گئی تھی اور جس کی ابتدا جہاز رانی کے اس تحقیقاتی ادارے سے ہوئی جسے شہزادہ ہنری نے ۱۴۱۹ء میں قائم کیا تھا۔ جب ہم نے یہ کوشش بھی کی کہ مختلف فنون میں مہارت حاصل ہو جائے اس وقت بھی ہم فنون و علم کے باہمی رشتوں کو سمجھ نہ سکے حتیٰ کہ جب سلیم سویم نے ترکی میں جدید تعلیم الجبرا، میکانکس، ٹرگنا میٹری، بیلسٹکس (Ballistics) اور معدنیات اس وجہ سے شروع کر دی کہ بندوق اور توپ سازی میں وہ یورپ والوں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اور اس تعلیم کے لیے سویڈن اور فرانس سے اساتذہ بھی بلائے گئے۔ اس وقت بھی بنیادی سائنسی علوم کی اہمیت پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ نتیجتاً ترکی یورپ کی برابری کبھی نہ کر سکا۔ اس کے تیس برس بعد مصر کے محمد علی نے اپنے آدمیوں کو کوئلہ اور سونے کے ذخیروں کی تلاش کے لیے تربیت دلوائی لیکن نہ ان کی اور نہ ان کے جانشینوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مصر میں علم طبقات الارض کی بنیادی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اور آج بھی جب کہ ہم سب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ فنون میں مہارت کے بغیر طاقت کا حصول ناممکن ہے، ہم یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ ترقی کا کوئی قریب کا راستہ نہیں ہے۔ جب تک سائنس کی بنیادی تعلیم ہماری معاشرت کا ایک لازمی جزو نہیں بنے گی ہم سائنس کا استعمال کرنے میں قاصر رہیں گے جو لوگ ہمیں بغیر بنیادی سائنس کے ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں وہ ہمارے دوست اور بہی خواہ نہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت لندن کے رسالہ "ایکنامسٹ" مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کے ایک مضمون جو شمسی توانائی کے متعلق ہے بخوبی ہو سکتی ہے کہ "اگر شمسی توانائی کا حصہ بڑے دل کے عالمی بحران کا واقعی جواب ہے تو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ توانائی ان بڑے بڑے آئینوں سے حاصل کر کے کام میں نہیں لائی جا سکتی جو مکان کی چھتوں پر لگائے جا سکتے ہوں اور جن کی بنیاد انیسویں صدی کے سائنس پر ہے۔ یہ مقصد کوانٹم فزکس (Quantum Physics)، بایو کمسٹری (Bio chemistry) یا اسی طرح کے دوسرے علوم پر عبور پا کر ہی حاصل ہو گا۔ آج کل کی جدید صنعتیں صرف جدید سائنس ہی کی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہیں۔

(جاری)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وفیات

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

از : سعید احمد اکبر آبادی

عزیزم میاں اسلم سلمہٗ (پروفیسر محمد اسلم) کا ۱۴ مارچ کا لکھا ہوا خط ۱۹ مارچ کو لاہور سے علی گڑھ میں موصول ہوا تو اس میں لکھا تھا کہ کل یعنی ۱۳ مارچ کو خواجہ عبدالرشید کا انتقال ہوگیا۔ پڑھتے ہی جی دھک سے ہو کر رہ گیا اور گزشتہ چالیس برس کے عہد اخوت و محبت کا ایک ایک واقعہ یاد آکر دل کو اشک خون رُلا گیا۔ اخبارات نے ان کی عمر ستر برس لکھی ہے۔ مرحوم خوب تندرست اور توانا تھے، لیکن چند برس سے ان کی بینائی خود بخود کم ہونی شروع ہوئی، وہ خود بھی بڑے پایہ کے ڈاکٹر تھے اور نامی گرامی ماہرین چشم سے مشورہ بھی کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں جب ان سے لاہور میں آخری ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی نگاہ برائے نام رہ گئی تھی، چند ماہ کے بعد ہی نابینا ہو گئے، آدمی تھے بیحد حساس، نفسیاتی طور پر اس حادثہ کا ان کے دل و دماغ اور صحت پر غیر معمولی اثر ہوا۔ آخر اسی صدمہ اور رنج میں ان پر فشار قلب کا حملہ ہوا، اسپتال میں داخل کیے گئے، وقت موعود آچکا تھا، چار دن کے بعد انتقال سے چار گھنٹے پہلے کلمہ طیبہ کا ورد زبان پر تھا پھر زبان بند ہوگئی اور اسی عالم میں جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ایک عربی شاعر نے اس قسم کے مواقع کے لیے کیا خوب کہا ہے :-

الی اللہ اشکو لا الی الناس اَنَّنی ۔۔۔ اری الارض تبقی والاخلاء تذہب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ: لوگوں سے نہیں، میں اللہ سے ہی اس بات کی فریاد کرتا ہوں کہ (یہ کیا غضب ہے) زمین تو اپنی جگہ قائم ہے لیکن دوست ہیں کہ ایک ایک کر کے سدھارتے ہیں۔

مرحوم لاہور کے ایک نامی گرامی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے برادر بزرگ خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم ایک اعلیٰ درجہ کے سرکاری افسر ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کے بلند پایہ صاحب قلم اور اسلامیات کے بڑے فاضل تھے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد برسوں تک انگریزی میں ایک ہفتہ وار یا پندرہ روزہ (اب ٹھیک یاد نہیں) رسالہ "الاسلام" کے نام سے کراچی سے اپنی ادارت میں شائع کرتے رہے، برصغیر کے اردو زبان کے نامور محقق ادیب اور مصنف جناب مشفق خواجہ (کراچی)، انہیں کے فرزند ارجمند ہیں۔

خواجہ عبدالرشید صاحب کی تعلیم تمام تر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں ہوئی سائنس میں گریجویشن کے بعد ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، دینی اور علمی ذوق موروثی تھا۔ نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ قرآن مجید سے عشق تھا۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے خاص انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے لیے درس قرآن کا ایک نظم قائم کر رکھا تھا جو بے حد مفید ثابت ہوا اور پاکستان میں اس درس کے اثرات آج بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، خواجہ صاحب اس حلقۂ درس میں پابندی اور بڑی لگن سے شریک ہوتے تھے، مولانا احمد علی صاحب مولانا عبیداللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ کے تلمیذ و تربیت یافتہ خاص اور داماد تھے، اس لیے مولانا کا درس قرآنی درحقیقت مولانا سندھی کے قرآنی افکار و نظریات کا ترجمان ہوتا تھا۔ اس تقریب سے خواجہ صاحب مولانا عبیداللہ سندھی سے بھی آشنا متعارف اور عقیدتمند ہوگئے اور پھر جب مولانا پنجاب میں قیام پذیر ہوئے تو خواجہ صاحب نے بلاواسطہ مولانا سے صرف ہم نشینی کا فیض نہیں اٹھایا، بلکہ باقاعدہ تلمذ اختیار کر کے مولانا سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چند رسائل کا درس لیا۔

مولانا احمد علی صاحب اور مولانا عبیداللہ سندھی کے تلمذ اور ان کی صحبت و معیت نے خواجہ صاحب کے ذوق دینی و فکر اسلامی کو نہایت پختہ، منجلی اور وسیع کر دیا۔ اب وہ قرآن مجید کا مطالعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے تھے تو محض برائے ثواب نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ان کو قرآن میں حقائق و معارف کا ایک جہان نظر آتا تھا۔ اس بنا پر ان کا قرآن سے شغف بڑھ گیا اور وہ روزانہ تلاوت بڑے شوق اور انہماک سے کرنے لگے۔

اگرچہ تعلیمی اعتبار سے ان کا خاص مضمون سائنس تھا لیکن علمی اور اسلامی ذوق و شوق کے باعث انھوں نے تاریخ، فلسفہ، تصوف، فارسی شعر و ادب، سیاسیات اور نفسیات کا مطالعہ بھی بڑی دلچسپی اور توجہ سے کیا تھا۔ علامہ اقبال سے ان کو عشق تھا۔ اور وہ کلام اقبال کے حافظ تھے۔ مقالہ نگاری اور تصنیف و تالیف کا بھی شگفتہ ذوق رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے انگریزی اور اردو میں بڑی کثرت سے مضامین لکھے، ان کے متعدد وقیع مقالات برہان میں بھی شائع ہو کر ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں، مضامین کے علاوہ متعدد کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں، جن میں معارف النفس (اردو)، فارسی شعراء پنجاب کا تذکرہ، فارسی زبان میں اور انگریزی زبان میں ایک کتاب جو ان کے مختلف مقالات کا مجموعہ ہے، مرحوم کو نوادر و جدید کتابوں اور نوادر اشیاء کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملازمت کے سلسلہ میں وہ مختلف ملکوں میں رہے تھے۔ علاوہ ازیں دنیا کی سیاحت بھی خوب کی تھی۔ اس لیے انھوں نے لاکھوں روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان کتب خانہ اور ایک نہایت وقیع عجائب خانہ (میوزیم) فراہم کیا تھا۔ میوزیم اپنی زندگی میں ہی پاکستان گورنمنٹ کو دیے گئے تھے اور وہ پاکستان کے نیشنل میوزیم میں ان کے نام سے محفوظ ہے کتاب خانہ میں مطبوعہ کتابوں کے عظیم ذخیرہ کے علاوہ بعض نادر مخطوطات بھی تھے۔ قرآن مجید کے بیسوں عجیب و غریب نسخے جو انھوں نے غیر ملکی سفروں اور سیر و سیاحت میں بصرف زر کثیر ادھر اُدھر سے حاصل کیے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا مرحوم اپنے پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اور وہ پرائیویٹ پریکٹس ہی کرتے تھے، لیکن عالمگیر جنگ دوم میں انھوں نے فوجی ملازمت کرلی، اور لفٹننٹ کرنل کے عہدہ تک پہنچے۔ جنگ کے زمانہ میں مختلف محاذوں پر رہے۔ اس سے ان کو جو تجربات ہوتے وہ اکثر ان کا تذکرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے تھے۔ ان کے فوج میں جانے کا واقعہ بھی سننے کے قابل ہے جسے انھوں نے راقم الحروف سے خود بیان کیا تھا۔ انھوں نے کہا: کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے جنگ میں برطانوی حکومت کی مدد نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے ہندو اور مسلمان جنگ میں بھرتی کو ناپسند کرتے تھے اور میں انھی لوگوں میں سے تھا۔ لیکن ایک دن مولانا عبید اللہ سندھی نے مجھ کو بلاکر حکم دیا کہ میں فوجی ملازمت اختیار کرلوں۔ میں نے عرض کیا: "حضرت! ایسا کرنا تو قومی مفاد کے خلاف ہوگا" مولانا نے حسب عادت بگڑ کر تند و تیز لہجہ میں فرمایا: بکنے دو کانگریس اور لیگ کو! دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کا بننا لازمی اور ناگزیر ہے۔ پس اگر مسلمان فوج میں بھرتی سے الگ رہے تو کل جب پاکستان بنے گا تو ہمارے پاس فوج کہاں ہوگی؟ اس کے بعد فرمایا: اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہوکر فوجی ٹریننگ لینا چاہیے تاکہ جنگ میں مرکھپ جانے سے جو نوجوان بچ رہیں گے وہ ہماری آزاد حکومت کے کام آئیں گے" خواجہ صاحب سے یہ بات سن کر یاد آیا کہ یہی بات مولانا عبید اللہ سندھی نے متعدد بار ہم لوگوں سے دلی میں فرمائی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ انھیں اس پر اصرار بھی تھا۔

بہرحال اپنے شیخ و مرشد کے حکم کی تعمیل میں فوجی کمیشن میں شرکت خواجہ صاحب نے منظور کرلی اور جنگ کے دوران میں وہ مختلف محاذوں پر سرگرم عمل رہے۔ جنگ کے اختتام پر وہ میرٹھ چھاؤنی میں آگئے۔ یہاں ڈیڑھ دو برس رہے ہوں گے کہ برما میں ایک اسپتال کے منتظم اعلیٰ (chief Administrator) بناکر بھیج دیے گئے۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے وقت یہ برما میں ہی تھے، لیکن یہ برما کے جس مقام پر تھے وہ کمیونسٹوں کا گڑھ تھا۔ ان لوگوں نے لوٹ مار اور قتل و قتال کی وہ گرم بازاری کی کہ یہاں رہنا مشکل ہوگیا، ہزاروں خاندان اجڑ گئے اور لوگ وطن سے بے وطن ہوگئے، خواجہ صاحب اور ان کی اہلیہ بھی یہاں سے جان بچاکر فرار ہوئے اور بہزار دقت و دشواری پاکستان پہنچے۔

یہاں ابتدا میں وہ لاہور کے میو اسپتال کے انچارج رہے، پھر راولپنڈی بھیج دیے گئے۔

© rasailojaraid.com

چند برسوں کے بعد قائد اعظم جناح اسپتال کے چیف ایڈمنسٹریٹر ہو کر کراچی آ گئے اور ایک مدت تک یہیں رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن لاہور واپس آ گئے اور لاہور چھاؤنی کے علاقہ میں ایک نہایت شاندار اور خوبصورت کوٹھی تعمیر کر کے یہاں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے۔

مرحوم کے بھائی خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم سے تو میرا تعلق دیرینہ اور اس زمانہ سے تھا جبکہ میں اورنٹیل کالج لاہور میں پڑھتا تھا، لیکن خواجہ عبدالرشید صاحب سے تعلق کا آغاز برہان کے ذریعہ ہوا وہ شروع سے برہان کے خریدار ہی نہیں، ندوۃ المصنفین کے محسنوں میں بھی شامل اور رسالہ اور کتابوں دونوں کے بڑے قدرداں اور مداح تھے، اس تقریب سے خواجہ صاحب ہم خدام ادارہ (مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور خاکسار راقم) سے عمیق تعلق خاطر پیدا ہو گیا اور ان سے باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی جس میں علمی اور اسلامی مسائل و مباحث پر گفتگو ہوتی تھی، اسی زمانہ میں برہان میں میرا مضمون "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد" سات قسطوں میں شائع ہوا تو اس وقت سے خواجہ صاحب کو اس ہیچمداں کے ساتھ غیر معمولی انس اور تعلق خاطر پیدا ہو گیا، لیکن یہ سب کچھ غائبانہ تھا۔ ان سے پہلی ملاقات (غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء) میں اس وقت ہوئی جب وہ مغربی لباس میں ملبوس اچانک اپنی بیگم کے ساتھ دفتر برہان میں آدھمکے۔ دفتر میں ہم سب سے ملاقات کی، پھر میاں بیوی دونوں میرے گھر پر آ گئے، دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور گھر میں ماحضر جو کچھ بھی تھا اسے ہنسی خوشی تناول کر کے واپس ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ صاحب میرٹھ چھاؤنی میں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، میرٹھ اور دلی میں فصل ہی کتنا ہے؟ اس پہلی ملاقات کے بعد بھی پندرھویں بیسویں دن خواجہ صاحب اپنی کار میں دلی آتے جاتے اور ملتے ملاتے رہے، ان دنوں میں ایک یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ بھائی مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب کی ایک بچی سخت بیمار ہوئی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے علاج کی غرض سے میرٹھ میں ایک مکان کا انتظام کیا اور بچی کو مع اس کی والدہ کے وہاں رکھ دیا، ان کے ساتھ میں بھی کم و بیش ایک ہفتہ میرٹھ میں مقیم رہا، اس طرح خواجہ صاحب اور ان کی بیگم جنھیں میں بھابی کہتا تھا دونوں کی عنایات و محبت چند سال

© rasailojaraid.com

کی صورت پیدا ہوگئی اور ان مجلسوں میں خواجہ صاحب کے بعض ایسے کمالات کا بھی علم ہوا جو پہلے معلوم نہیں تھے، مثلاً یہ کہ وہ موسیقی کے بھی بڑے ماہرفن اور فاضل تھے، موقع غنیمت جان کر میں نے اس میں ان سے دو تین سبق لیے اور ان کے نوٹ لکھے۔

چند مہینوں کے بعد خواجہ صاحب برما چلے گئے۔ لیکن اب خواجہ صاحب سے جو قلبی اور روحانی تعلق پیدا ہوگیا تھا اور خواجہ صاحب میں طبعاً علمی و اسلامی مسائل و مباحث میں غور و فکر کی جو خوبی تھی اس کی وجہ سے اوسطاً مہینہ میں دو مرتبہ طویل طویل خطوط برابر لکھتے رہے اور ادھر پابندی سے میں بھی انھیں لکھتا رہا۔ بدقسمتی سے تقسیم اور دوسرے حوادث کے باعث ان کے سب خطوط تو میرے پاس محفوظ نہیں رہے لیکن میرا ایک ایک خط انھوں نے محفوظ رکھا۔ چنانچہ دو تین برس ہوتے انھوں نے انگریزی میں اپنے نام مشاہیر کے خطوط کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں غالباً سب سے زیادہ تعداد میرے ہی مکاتیب کی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا تقسیم کے وقت خواجہ صاحب برما میں مقیم تھے، تقسیم کے نتیجہ میں دلی کے مسلمانوں پر جو قیامت گذری اس کی خبریں ریڈیو اور اخبارات سے معلوم ہونے پر خواجہ صاحب اور ان کی بیگم میری طرف سے کس درجہ فکرمند اور پریشان تھے اور اس سلسلہ میں ایک کیسا عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا؟ اسے خود خواجہ صاحب کی زبان سے سنئے جس کو انھوں نے بڑی تفصیل سے تقسیم کے بعد اپنے پہلے خط میں لکھا تھا، افسوس ہے، یہ خط محفوظ نہیں ہے، اس لیے اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھتا ہوں: خواجہ صاحب نے لکھا تھا:

"ہم دونوں روزانہ صبح اور شام بی۔بی۔سی سے خبریں سنتے تھے اور دلی کی خبریں سن سن کر ہوش و حواس اڑے جاتے تھے، آخر ۷ ستمبر کی خبروں میں جب یہ سنا کہ آج قرولباغ مسلمانوں سے خالی ہوگیا تو آپ کی اور مفتی صاحب کی طرف سے سخت تشویش لاحق ہوئی۔ کوئی اور ذریعہ تو تھا نہیں، میں نے رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو الگ الگ دو ارجنٹ ٹیلی گرام بھیجے اور ان سے آپ لوگوں کی خیریت طلب کی۔ مگر ان کا جواب نہیں آیا تو پھر میں نے

© rasailojaraid.com